Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:10 (1967)

علم اور سائنس سے متعلق

اسلام کا نقطۂ نظر

محمد مظہر الدین صدیقی

اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے کہ علم اور سائنس کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے. علم اور سائنس کی ماہیت کے متعلق چند باتیں عرض کر دینی ضروری ہیں۔ علم خواہ فلسفیانہ ہو یا سائنسی، اس کا ماخذ بالآخر انسان کا تجربہ ہے۔ جو علم تجربہ سے ماخوذ نہ ہو، وہ صحیح معنوں میں علم نہیں۔ لیکن تجربہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ واقعات اور حقائق کا مشاہدہ کیا جائے۔ اس طرح واقعات و حقائق کا مشاہدہ ہر علم کی اساس و بنیاد ہے۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے جن واقعات و حقائق کا علم ہوتا ہے، وہ حقیقی علم کی تعریف میں نہیں آتے۔ بلکہ اگر واقعات و حقائق کی درجہ بندی کی جائے یا انہیں خاص خاص عنوانات کے تحت مرتّب و مہذّب شکل میں پیش کیا جائے تو اس قسم کے مرتّب واقعات بھی علم کی تعریف میں نہیں آسکتے۔ مثلاً ٹیلی فون کی ڈائرکٹری میں بعض معلومات کو ایک مخصوص انداز میں مرتب کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ٹیلی فون ڈائرکٹری کو زبانی یاد کر لے تو ہم اسے عالم نہیں قرار دے سکتے، اپنے اصلی مفہوم کے لحاظ سے علم یہ ہے کہ ہم حقائق کی تہ تک پہونچ کر اُن کی معنویت کا ادراک کریں۔ واقعات کے اسباب کا تجزیہ کر سکیں، اور طبعی یا ساجی مظاہر کی پشت پر جو قوانین کارفرما ہیں، ان کا انکشاف کریں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کو اعلیٰ ترین علم قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ فلسفی واقعات و حقائق کے معنی کا ادراک کرتا ہے اور اُن کے جوہر کو پالیتا ہے۔ اسی طرح سائنس دان صرف طبعی واقعات کا مطالعہ نہیں کرتا. بلکہ ان واقعات کی تہہ میں جو عمومی قوانین کارفرما ہوتے ہیں، ان کا ادراک بھی کرتا ہے۔ ایک مورّخ بھی تاریخی واقعات کو قلم بندہی نہیں کرتا بلکہ ان کا تجزیہ کر کے یہ بتاتا ہے کہ کن اسباب و قوانین کے تحت یہ واقعات ظہور میں آئے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ علم کی ترقی صرف مشاہدہ کی قوت پر موقوف نہیں اور نہ اُن آلات کی ترقی پر موقوف ہے جن کے ذریعہ انسان کی طاقتِ مشاہدہ میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ علم کی ترقی کا دار و مدار اس امر

پر بھی ہے کہ انسان اپنے تجربات و مشاہدات سے عمومی اصول و قوانین کے ادراک کی کتنی قابلیت رکھتا ہے۔

ظہورِ اسلام سے قبل انسانی علم کی ترقی اس وجہ سے رُک گئی تھی کہ لوگ دینیاتی یا کلامی مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے۔ نو فلاطونی تصوّف کی مقبولیت نے بھی علمی انحطاط پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا کیوں کہ فلاطینوس نے وجد اور سرمستی کو علمِ الٰہی کا ایک اہم ذریعہ قرار دے دیا تھا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کا علم حاصل کرنے کے لئے انسان کو اپنے ذہنی دریچے بالکل بند کر لینے چاہئیں تاکہ بیرونی احساسات و مشاہدات کی کوئی روشنی ذہن میں داخل نہ ہوسکے۔ اسی طرح عیسائیوں نے اپنی ساری توجہات اس مسئلہ پر مرتکز کر رکھی تھیں کہ اقانیم ثلاثہ یعنی باپ۔ بیٹے اور روح القدس کا باہمی تعلق کس نوعیت کا ہے۔ یہ سارا دینیاتی اور کلامی مجادلہ عرصہ دراز تک جاری رہا مگر کسی نے محسوس واقعات یا مادّی حالات کے ساتھ ان مباحث کا ربط معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی۔

اسلام نے انسان کو سائنسی اور فلسفیانہ علم کی طرف متوجہ کیا جس میں محسوس واقعات اور مشہود حقائق کا علم بھی شامل ہے۔ قرآن کی جو پہلی سورت نازل ہوئی، اس میں لکھنے اور پڑھنے کی اہمیت جتائی گئی تھی:۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم۔ (سورہ علق۔ آیات ۱تا۴)

آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیئے جس نے مخلوقات کو پیدا کیا۔ جس نے انسانوں کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ پڑھا کیجئے۔ آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے حکم پر اس طرح عمل کیا کہ جب جنگ بدر کے بعد کفارِ مکہ مسلمانوں کے قیدی بن کر آئے تو ان میں ایسے اشخاص کو جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ وہ مدینہ کے منتخب مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور اس کے عوض ان سے وعدہ کیا کہ ان سے کوئی زرِ فدیہ وصول نہیں کیا جائے گا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مساجد کے ساتھ ساتھ باقاعدہ مکاتب قائم کئے گئے۔ جہاں مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا اور قرآن فہمی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ قرآن علم پر کتنا زور دیتا ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ، نبی کی زبان سے کہلواتا ہے:۔ قل ربِّ زدنی علماً (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۱۱۴) (اے پیغمبر کہو کہ خدا میرے علم میں اضافہ کرے)۔

قرآن کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اہلِ حکومت کو علم کی صفت سے لازمی طور پر متصف ہونا چاہیئے :۔

وقال لہم نبیّہم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکاً۔ قالوا انّٰی یکون لہ الملک علینا ونحن احق بالملک منہ ولم یوت سعۃ من المال۔ قال ان اللہ اصطفہ علیکم و زادہٗ بسطۃً فی العلم والجسم۔ (البقرہ ۔ ۲۴۷)

(اور اُن کے نبی نے ان سے کہا، اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے اس کو ہم پر حکمرانی کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے حالاں کہ بہ نسبت اس کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور اس کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی۔ ان پیغمبر نے جواب دیا کہ اوّل تو اللہ نے تمہارے مقابلہ میں اس کو منتخب کیا ہے، اور دوسرے علم اور جسامت میں اس کو زیادتی دی ہے۔)

قرآن نے علم اور اہلِ علم کو انسانی زندگی میں کتنا اہم مقام دیا ہے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ صاف لفظوں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ صرف اہلِ علم ہی صحیح معنوں میں، خدا سے ڈرتے ہیں :۔

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماءً فاخرجنا بہ ثمرات مختلفاً الوانہا۔ ومن الجبال جددٌ بیضٌ وحمرٌ مختلفٌ الوانہا وغرابیب سود۔ ومن الناس والدواب والانعام مختلفٌ الوانہ کذالک۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ (سورہ فاطر۔ آیات ۲۶، ۲۷۔)

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے مختلف رنگتوں کے پھل نکالے اور اسی طرح پہاڑوں کے بھی مختلف حصّے ہیں (بعضے) سفید اور (بعضے) سرخ کہ ان کی رنگتیں بھی مختلف ہیں اور بعضے نہ سفید نہ سرخ بلکہ بہت گہرے سیاہ اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی بعض ایسے ہیں۔ کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں، اور خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں)۔

ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے اللہ تعالیٰ بعض طبعی اور مادی مظاہر کا ذکر فرماتا ہے اور اس کے بعد یہ اعلان کرتا ہے کہ صرف وہی لوگ درحقیقت خدا کا خوف کرتے ہیں جنہیں علم سے نوازا گیا ہو۔ اس لئے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کے طبعی مظاہر کے علم میں (جو درحقیقت سائنس ہے) اور خدا کے خوف میں کیا باہمی علاقہ ہے۔ اس علاقہ کا پتہ چلانا کچھ زیادہ دشوار نہیں، اگر اس امر کو مدِنظر رکھا جائے کہ جو لوگ تاریخ اور طبعی فطرت میں خدا کے عمل اور قانون کا درک رکھتے ہیں، انہیں اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کو محیط ہے اور اس کے قوانین کی گرفت اتنی سخت ہے کہ کائنات کی کوئی شئی، معاشرہ

کا کوئی فرد اور عالمِ انسانیت میں بسنے والی کوئی قوم قوانینِ الٰہی کے اثر سے بچ کر نہیں نکل سکتی۔ اور یہ کہ صرف وہی قومیں بقائے حیات کی جدو جہد میں کامیاب ہو سکتی ہیں جو اپنے معاشرہ اور ریاست کی تشکیل میں نوامیس فطرت اور قوانینِ الٰہی کی پوری پوری رعایت کرتی ہیں۔ عام لوگ تو اپنے روز مرّہ کے کاموں میں اس طرح مصروف رہتے ہیں کہ انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ اُن کے معاشرہ کی اخلاقی حالت کا ان کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا مگر اہلِ علم جانتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ قوموں کی تقدیر اور اُن کے مستقبل کی تشکیل ان کے اعمال کے لحاظ سے ہوتی ہے، اعمال حسنہ سے قوموں کی تقدیر سنورتی ہے اور بد اعمالیوں سے ان کی تقدیر بگڑ جاتی ہے۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں قرآن پہلی الہامی کتاب تھی جس نے اپنے ماننے والوں کو اس بات سے منع کیا کہ وہ ہر اس چیز کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں جو خدا کے نام پر اُن کے سامنے پیش کی جائے۔ اس کے برعکس قرآن نے یہ تعلیم دی کہ وہ اس کی آیات پر غور و فکر کریں۔ انہیں سمجھ بوجھ کر مانیں اور اندھے پن سے کسی چیز کو قبول نہ کرلیں۔

والذین اذا ذکروا بآیات ربہم لم یخروا علیہا صما و عمیاناً (الفرقان۔ آیت ۷۳)

(اور مومن وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے)

سائنس کے بارے میں قرآن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ تاریخِ عالم کی پہلی مذہبی کتاب ہے، جس نے انسان کو کائنات کے طبعی مظاہر پر غور و فکر کرنے کی تلقین کی۔ قرآن میں دینیاتی یا کلامی مسائل کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ اس کے برعکس اس کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے طریقِ کار کو جاننے کے لیئے انسان کو مظاہر کائنات اور مادی فطرت پر غور و فکر کرنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسان مظاہرِ فطرت پر غور کرے تو ان میں اُسے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ملیں گی۔ قرآن میں ایمان والوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی خلقت پر غور و فکر کرتے ہیں (سورہ آل عمران ۔ آیت ۱۹۸) اسی آیت میں قرآن یہ بھی ارشاد فرماتا ہے کہ رات اور دن کے اختلاف اور زمین و آسمان کی خلقت میں اہلِ عقل کے لیئے نشانیاں ہیں۔

ان فی خلق السمٰوات والارض و اختلاف اللیل والنہار لآیاتٍ لاولی الالباب۔ الذین

یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلاً۔

(بلاشبہ آسمان اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہلِ عقل کے لئے دلائل ہیں۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی نہیں پیدا کیا۔)

قرآن سے ایک دو نہیں، متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں جن میں انسان کو مظاہر کائنات اور طبعی فطرت کے مشاہدہ کی تلقین کی گئی ہے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب دینیات اور کلام کو اعلیٰ ترین اور اشرف ترین علم کی حیثیت دی گئی تھی۔ مزید برآں اس زمانہ میں لوگ صرف اپنے داخلی افکار پر بھروسہ کرنے کے عادی تھے جن میں بیرونی مشاہدات سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ ایسے زمانہ میں قرآن نے حواس کو ایک ذریعۂ علم کی حیثیت سے ان کا جائز مقام عطا کیا۔ اور یہ بتایا کہ عقل و فہم کی طرح حواس بھی ادراکِ حقیقت کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

ولا تقف مالیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفواد کل اولٓئک کان عنہ مسئولاً۔ (بنی اسرائیل۔ آیت ۳۶)

(اور جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے نہ پڑے رہو۔ بے شک کان، آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی بابت پوچھ ہوگی)

سائنسی علم کے حصول کی طرف یہ ایک بڑا قدم تھا جب حسّی علم کو قرآن نے اس کا جائز مقام دلوایا، حالاں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب صوفیانہ وجد و حال اور دینیاتی غور و فکر کو علم کا سب سے اہم ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسّی علم کی طرف لوگوں کو رغبت دلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے معجزہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم طبعی فطرت میں خدا کی تخلیق کے عمل کا مشاہدہ کرو تو اس عالم میں کوئی ایسی چیز نہ پاؤ گے جو معجزہ سے کم درجہ کی ہو۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل اس حقیقت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن نے فہم تاریخ کو ترقی دینے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ قرآن کی کئی ایک سورتوں میں قدیم پیغمبروں کا ذکر پایا جاتا ہے جنہوں نے اپنے اپنے معاشروں کو متعدد قسم کی برائیوں اور مفسدات سے پاک کرنے کی کوشش کی اور اس جدوجہد میں انہیں ایسے افراد و طبقات کی

مخالفت مول لینی پڑی ۔ جن کا فائدہ اسی میں تھا کہ ان کا معاشرہ جس حال میں ہے اسی حالت پر چلتا رہا ہے، اور کوئی خوشگوار تبدیلی نہ پیدا ہو۔ پھر قرآن نے ان پیغمبروں کی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ قومیں اور جماعتیں جنہوں نے معاشرتی اصلاح وتبدیلی کے تقاضوں کو رد کردیا، بالآخر اپنے اعمال کی پاداش میں ہلاک کردی گئیں، بالکل اسی انداز سے قرآن کفارِ مکہ کو اس امر کا مورد الزام ٹھہراتا ہے کہ وہ ان سماجی اور تاریخی قوتوں کے عمل کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں جو خود ان کے معاشرہ میں اس وقت کارفرما تھیں ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

یاایھا النبی حرض المومنین علی القتال ۔ ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائۃٌ یغلبوا الفاً من الذین کفروا بانہم قومٌ لا یفقہون ۔ (الانفال ۔ آیت ۶۴)

(اے پیغمبر آپ مومنوں کو جہاد کی ترغیب دیجئے ۔ اگر تم میں کے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں کے سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آجاویں گے، اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے ۔)

یہاں قرآن کہتا ہے کہ کفارِ مکہ عقل وخرد سے بے بہرہ ہیں ۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن معنوں میں کفار محروم العقل تھے ۔ روزمرہ کی زندگی کے کاروبار کے لئے جس عقل کی ضرورت ہوتی ہے، کفارِ قریش اس سے یقیناً بہرہ ور تھے کیوں کہ وہ بڑے ہوشیار تاجر تھے ۔ اسی طرح وہ سیاسی سمجھ بوجھ میں بھی مسلمانوں سے کسی طرح کمتر نہ تھے ۔ اس لئے قرآن کا یہ الزام کہ یہ لوگ بے عقل ہیں، صرف اسی لحاظ سے درست ہوسکتا ہے کہ وہ واقعات وحوادث کے مشاھدہ سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی قابلیت سے محروم تھے جب کہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے باعث مسلمانوں میں یہ قابلیت پیدا ہوگئی تھی ۔ پھر قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ کفارِ مکہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اس وجہ سے نہیں کہ ان میں اس عقل کی کمی ہے جو عملی اغراض کے کام آتی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ عقلِ نظری سے بے بہرہ ہیں یعنی واقعات وحقائق کی تہ تک پہنچ کر وہ ان سے کوئی عمومی اصول یا صداقت اخذ نہیں کر سکتے ———— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم نے نہ صرف مسلمانوں میں خارجی واقعات و مظاہر کے مشاہدہ کا رجحان پیدا کیا بلکہ انہیں فلسفیانہ غور وفکر کی طرف مائل کیا اور ان کی عقل نظری کو بھی ترقی دی یعنی اس عقل کو جو خارجی واقعات وحوادث کے مطالعہ اور مشاھدہ سے اصول ونظریات اخذ کرتی ہے معاشرتی حالات پر غور کرنے کے بعد اپنے لئے صحیح راہ عمل متعین کرتی ہے ۔